نَاسخ

کی

سوانح حیات

باب دوم

ریختہ کُتب مرکز بیگ راج
3، 2، 1 اور برائے خواتین
اُردو ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)
بیگ راج: - +92-307-7002092

ناسخ
فکروفن

ریختہ کتب مرکز بیگ راج
1، 2، 3 اور برائے خواتین
اردو ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)
بیگ راج: - +92-307-7002092

ڈاکٹر حسن نشاط

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 - 307 - 7002092

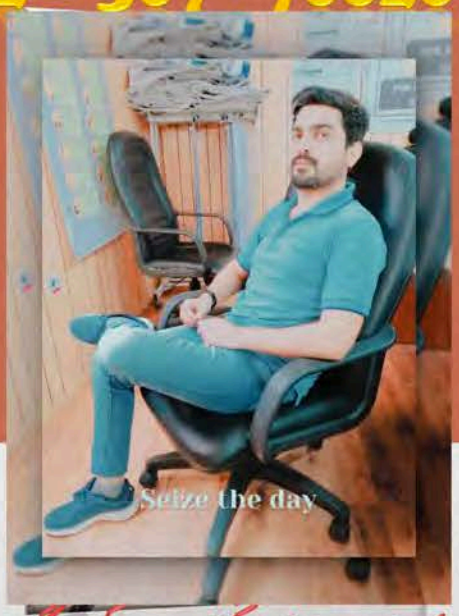

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کتب مرکز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ واٹس ایپ پر خواتین کیلئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے۔ نیچے دیئے گئے لنکس کی مدد سے با آسانی واٹس ایپ گروپ یا ٹیلی گرام چینل میں شامل ہوا جا سکتا ہے اور ایڈمن سے رابطہ کیلئے ایڈمن کے نمبر پر کلک کر کے ڈائریکٹ ایڈمن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک:

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBLJHJMKBQBNKUPZFE5Z

&

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

ریختہ کُتب مرکز بیگ راج
1، 2، 3 اور برائے خواتین
اُردو ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)
بیگ راج: - +92-307-7002092

جہاں تک ناسخ کی تاریخ وفات کا تعلق ہے قریب قریب تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی وفات ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں بمقام لکھنؤ واقع ہوئی اور ٹکسال میں مدفون ہوئے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق کوئی تذکرہ نویس بحث نہیں کرتا۔ تمام تذکرے اس سلسلے میں خاموش نظر آتے ہیں، لہذا ہمیں اس کی تفصیل سے مکمل طور پر بحث کرنا ہے کہ ان کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی ہے؟

ناسخ کا ذکر سب سے پہلے جو تذکرہ کرتا ہے وہ مصحفی کا ریاض الفصحا (یعنی سے تذکرۂ ہندی گویان) ہے۔ مگر بدقسمتی سے وہی کمی نمایاں ہے جو عام تذکروں میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے، یعنی اس میں بھی مصحفی نے نہ تو ناسخ کی تاریخ پیدائش پر کوئی روشنی ڈالی ہے اور نہ ان کے حالات و کوائف سے کوئی بحث کی ہے اس سے صرف اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ناسخ کی پیدائش کہاں ہوئی اور ان کے والد کا نام کیا تھا اور ان کا اصلی وطن کہاں تھا مصحفی کی عبارت[1] حسب ذیل ہے۔

"شیخ امام بخش، ناسخ تخلص خلف الرشید خدا بخش مرحوم وطن بزرگانش دارالسلطنت لاہور و خودش در فیض آباد تولد شد، بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ

---

[1] غلام ہمدانی مصحفی :- ریاض الفصحا، (تذکرہ ہندی گویان)، مرتبہ مولوی عبدالحق ۱۹۳۴ء

جواں ہمیں وسپاہی وضع حلیم الطبع ومہذب الاخلاق دیدش عمرش سی و ہفت سالہ است، از سن بیست سالگی بمقتضائے موزونی طبع فکر شعر ھندی می کند ..... "

مندرجہ بالا عبارت کی روشنی میں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اوائل عمری سے ناسخ کا رحجان شعر کی طرف تھا اور جسمانی طور پر جوان رعنا تھے، اخلاقاً خوش طبع اور مہذب تھے۔ تاریخ پیدائش سے متعلق ہمیں کوئی مواد نہیں ملتا جو ناسخ سے پہلے کا ہو اس لئے ہم بنیادی اہمیت کسی تذکرے کو نہیں دے سکتے۔

البتہ ناسخ کے بعد ان کے شاگرد خاص میر اوسط علی رشک کا دیوان ہے جو اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، اسی کی بنیاد پر قاضی عبدالودود نے تاریخ اور سن پیدائش کا تعین کیا ہے جو بہت حد تک قابل قبول ہے۔ قاضی[1] صاحب رقم طراز ہیں۔

" کلیات ناسخ مطبوعہ میں ایک شعر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ۵ محرم کو پیدا ہوئے تھے[2]۔"

سال ولادت بصراحت کسی تذکرے میں نہیں اور نہ کلیات اس پر روشنی ڈالتا ہے لیکن دیوان رشک مطبوعہ میں ایک قطعۂ تاریخ ہے جس کا مادہ ہے ؎

مُرد اے ہے بسال شست و نہم

ناسخ کی وفات جیسا کہ اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے، پنج شنبہ دن چوبیسویں جمادی الاولیٰ کو ۱۲۵۴ھ میں واقع ہوئی تھی، اس حساب سے سال ولادت ۱۱۸۵ھ یعنی ۱۷۷۱ء ٹھہرتا ہے۔

---

[1] قاضی عبدالودود بیرسٹر پٹنہ "متفرقات" نقوش لاہور، ۱۹۵۷ء

[2] عبارت قاضی صاحب " یہ شعر میں نے ایک خط میں جو العلم کراچی میں چھپا ہے نقل کر دیا ہے رشک کا ایک شعر بھی اس پر مشعر ہے۔" عبدالودود

"رشک ناسخ کے شاگردانِ خاص میں سے تھے اس لئے اس سن میں شبہے کی مطلقاً گنجائش نہیں۔"

قاضی صاحب کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ناسخ کی پیدائش ۵ محرم ۱۱۸۵ھ یعنی ۱۷۷۱ء میں ہوئی۔ مگر قاضی صاحب نے ناسخ کے جس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں انھوں نے اپنی پیدائش کے دن کا ذکر کیا ہے اس کا ایک لفظ[۱] اختلافی ہے ؎

رہے کیونکر نہ دل ہر دم نشانہ ناوکِ غم کا
کہ ہے میرا تولّد ہفتم ماہ محرّم کا

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ وہ تاریخ ۵ محرم کی تھی اور خود ناسخ کا بیان یہ ہے کہ وہ ساتویں محرم کو پیدا ہوئے ہے، ہو سکتا ہے کہ قاضی صاحب نے سہو حافظہ کی وجہ سے ہفتم کی بجائے پنجم لکھ دیا ہو یا یہ بھی عین ممکن ہے کہ جو نسخہ قاضی صاحب کی نظر سے گذرا ہو اس میں "پنجم" ہی درج ہو۔

بہر حال یہ اختلاف اتنا اہم نہیں جو کسی تحقیقی نتیجے پر اثر انداز ہو، البتہ قاضی صاحب نے جس حتمی فیصلے کا اظہار "شبہے کی مطلقاً گنجائش نہیں" لکھ کر کیا ہے وہ تھوڑا سا بحث طلب ہے۔ جہاں کسی تحقیق و تدقیق کی بات آتی اور اس میں کثرت آراء کا اتفاق کسی موضوع پر مکمل طور پر نہیں ہوتا اس وقت تک کسی فرد واحد کے بیان پر ہم سو فیصدی ایمان نہیں لا سکتے، کیونکہ عین ممکن ہے کہ تحقیق و تجسس کے میدان میں آئندہ کوئی ایسا ثبوت مل جائے جس کی بنیاد پر اس فرد واحد کے قول کی تردید ہو جائے تو پھر وہاں محقق کے نتیجۂ تحقیق پر نکتہ چینی کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے، لہٰذا اس سلسلے میں اگر ہم (قاضی صاحب سے معذرت کے ساتھ) یہ کہیں کہ زیادہ ترقرین قیاس یہ ہے کہ ناسخ کی پیدائش

---

[۱] کلیاتِ ناسخ، مطبوعہ نول کشور (اردو سیمینار مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ) دیوان اول ص۱۲ حاشیہ :-

۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں ہوئی۔ کیونکہ ان کے شاگرد خاص رشک کا بیان اس سلسلے میں زیادہ وقیع اور باوزن معلوم ہوتا ہے تو شاید یہ بات قابل گرفت نہ ہو۔ بہرحال ہمیں یہ تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں کہ ناسخ ۷ محرم ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں بمقام[1] فیض آباد پیدا ہوئے۔

ناسخ کے سن ولادت کے تعین کے بعد دوسرا اہم مسئلہ ان کی ولدیت کا ہے جو آج تک مورخین ادب کے لئے اختلافی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جو مواد ہم کو ملتا ہے وہ مصحفی ہی کا فراہم کردہ ہے۔ مصحفی کہتے ہیں[2]۔

"شیخ امام بخش ناسخ تخلص، خلف الرشید خدا بخش مرحوم ......"

مصحفی کے بیان کے علاوہ بھی دیگر تذکرہ نویس ناسخ کے والد کا نام خدا بخش لاہوری لکھتے ہیں۔ یہاں صرف یہ اختلاف ہے کہ ناسخ خدا بخش مرحوم کے غلام تھے، پسر صلبی تھے یا پسر متبنّیٰ، کیونکہ مصحفی کے علاوہ اس ضمن میں صرف سید محسن علی محسن صاحب سراپا سخن شاگرد میر اوسط علی رشک اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ ناسخ خدا بخش

۱؎ قریب قریب تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں۔ راقم

۲؎ غلام ہمدانی مصحفی :۔ ریاض الفصحاء (تذکرہ ہندی گویان) سے قریب قریب تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں، صرف عبدالرؤف عشرت اس سے اختلاف کرتے ہیں انکی عبارت ملاحظہ ہو:۔ "شیخ امام بخش ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور کریم بخش بساطی نے فیض آباد میں ان کو پرورش کیا"، عشرت کا یہ بیان تمام تذکروں سے الگ ہے، ہم اسے تسلیم کر سکتے تھے مگر دور دور تک کہیں بھی ان کے تحریر کردہ نام کی شباہت دیگر تذکرہ نویسوں کے نام سے نہیں کہ ہم اس پر تھوڑی دیر کے لئے سہو یا لغزش قلم کا گمان کر لیں بلکہ عشرت نے جو نام ناسخ کے پدر بزرگوار کا لکھا ہے وہ صرف آب بقا کے صفحات تک محدود ہے۔ اور کچھ مبہم بزرگ ناصر دہلوی کے حوالے سے عشرت نے یہ بات کہی ہے ان کی نہ تو کوئی تاریخی حیثیت ہے اور نہ شاعرانہ۔ لہٰذا یہ بیان غیر مستند اور بے وزن ہے۔
(راقم مقالہ)

لاہوری کے بیٹے تھے، تمام تذکرہ نویس[1] یا تو انھیں غلام کہتے ہیں یا پسر متبنّٰی، یہ بحث بلاشبہ پیچیدہ ہے۔ جہاں تک مصحفی کے بیان کا تعلق ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ناسخ خدا بخش لاہوری کے فرزند صلبی تھے، لیکن انھوں نے عمداً یا احیاناً اس بحث کو چھیڑا نہیں کہ ناسخ خدا بخش کے پسر صلبی تھے یا متبنّٰی، بلکہ مصحفی نے سرسری بیان پر اکتفا کی ہے۔ ان کے بیان پر تھوڑی دیر کے لئے غور کریں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو یا تو اختلافی مسئلہ سمجھ کر نہیں چھیڑا یا اس وقت تک یہ بحث منظر عام پر نہیں آئی تھی کہ وہ اسے اہمیت دیتے، اغلب گمان یہ ہے کہ ناسخ کی شہرت عام ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ حاسدین نے اٹھایا ہو اور اسے طرح طرح سے ہوا دی گئی ہو لیکن ولدیت کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے ایک اور پہلو نظر میں رکھنا ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ ناسخ کے پدر بزرگوار کا پیشہ بھی ناسخ کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس سے ہمیں بحث کو آسان بنانے میں کافی مدد مل جاتی ہے۔

اس ضمن میں بھی تذکرہ نویس مختلف الخیال ہیں، بعض تذکرہ نویس خدا بخش کو خیمہ دوز لکھتے ہیں اور بعض تاجر لکھتے ہیں اور یہ بیان زیادہ وقیع معلوم ہوتا ہے، سید محسن علی محسن پہلے تذکرہ نویس جو انھیں تاجر لکھتے ہیں۔ شاید اسی بنیاد پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جو استدلال پیش کیا ہے، وہ بہت حد تک قابل قبول ہے وہ لکھتے ہیں۔

"خدا بخش خیمہ دوز کو بعض لوگوں نے خیمہ دوز لکھا ہے کہ صاحب سراپا سخن کا بیان ہے کہ تاجر تھے، صحیح معلوم ہوتا ہے، ورنہ ایک خیمہ دوز کی دولت کے لئے ہنگامے کیا پیش آتے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ناسخ کے والد خیمہ دوز ہوتے تو پھر اس قدر دہ

---

[1] عبدالغفور نساخ سے لے کر رام بابو سکسینہ تک۔ راقم مقالہ

[2] سید محسن علی محسن صاحب سراپا سخن

[3] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مصنف لکھنؤ کا دبستان شاعری

صاحب جائداد کیسے ہوتے، جس کی وجہ سے ان کی اولاد کو آپس میں مقدمہ بازی تک کی نوبت آئی، اس کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ واقعی مالی اعتبار سے صاحب حیثیت تھے مختلف تذکروں کی روشنی جب ہم اس پر سیر حاصل بحث کر رہے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے یہ بھی خیال رکھنا ہے کہ یہ تذکرے دو گروہ میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو ناسخ کو خدا بخش کا خلف الرشید لکھتا ہے اور دوسرا گروہ غلام اور پسر متبنیٰ لکھتا ہے مصحفی[1]، محسن[2] اور ناصر[3] لکھنوی ناسخ کو خلف الرشید خدا بخش لاہوری لکھتے ہیں اور نادر[4] "ابن خدا بخش" لکھتے ہیں۔ یہ پہلا گروہ ہے۔

دوسرے طبقے کا آغاز عبدالغفور نساخ[5] سے ہوتا ہے انھوں نے محسن کے حوالے پر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"لیکن یہ تاجر مذکور کے غلام مشہور تھے"

اور اس کے ثبوت میں انھوں نے دو رباعیاں پیش کی ہیں ؎

کہتے رہے اعمام خدا دوست سے غلام
میراث پدر میں نے مگر پائی تمام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

نساخ کے بعد بقول آزاد رام بابو سکسینہ[6] تک تمام تذکروں نے یہی بات دہرائی ہے کہ ناسخ خدا بخش کے پسر متبنیٰ تھے۔ اس سلسلے میں دوسری رباعی بھی

---

[1] مصحفی، ریاض الفصحا، ص ۳۲۴ [2] سید محسن علی محسن سراپا سخن
[3] سعادت علی خاں ناصر لکھنوی، تذکرہ معرکۂ خوش زیبا
[4] کلب حسین خاں نادر، تذکرۂ نادر
[5] عبدالغفور نساخ، سخن شعرا
[6] رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو

ملاحظہ ہو ؎

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیلِ فرزندی ہے
میراث نہ پاسکا کبھی کوئی غلام

تعجب ہے کہ آزاد نے بغیر کسی تحقیق کے یہ بات لکھ دی ہے جس کی کوئی بھی معتبر سند نہیں، آزاد کے انداز تحریر نے اس واقعے کو اور بھی ہوا دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ذہن پر یہ بات چھا سی گئی کہ ناسخ یقیناً خدا بخش لاہوری کے پسر متبنّٰی تھے آزاد کے بیان کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جو استدلال پیش کیا ہے وہ بھی قابل دید ہے۔

"۔۔۔۔ اگر درحقیقت غلام نہ ہوں، متبنّٰی ہوں لیکن فرزندی پھر بھی مشتبہ ہے، ایک شعر میں اگرچہ وہ لکھتے ہیں ؎

وارث ہونا دلیلِ فرزندی ہے
میراث نہ پاسکا کبھی کوئی غلام

وراثت پانا اگرچہ غلامی سے آزادی دلاتا ہے لیکن حقیقی فرزند ہونا اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر فرزند ہوتے تو ان کے زمانے کے لوگ اس کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل کرتے اور انھیں کیوں بار بار صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہوتی۔"

میرا خیال ہے کہ صدیقی صاحب نے اپنے مقالے کو طوالت سے بچانے کی غرض سے اس قسم کا فیصلہ صادر کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ضخیم مقالے کے لئے یہ بحث زیادہ اہم نہیں تھی۔ مگر پھر بھی ان کے فیصلے کی اہمیت تو تھی ہی، لیکن انھوں نے غیر ضروری حد تک اس معاملے

میں اختصار سے کام لیا ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ اگر یہ فرزند ہوتے تو ان کے زمانے کے لوگ اس کے تسلیم کرنے میں کیوں تامّل کرتے، اس دعویٰ کی مکمل دلیل نہیں ہے کہ ناسخ خدا بخش کے پسر صلبی نہیں تھے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ناسخ نے جو رباعیاں اس سلسلے میں کہی ہوں وہ ان کی صفائی کی گواہ ہوں کیونکہ رباعیوں کا انداز بھی رسمی اور رواجی ہے اس سے کسی شدید دل شکنی اور مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا۔

ناسخ کا یہ کہنا کہ "ستم گاروں" کو اس "دعویٰ باطل" سے یہ حاصل ہوا کہ وہ مجھے بدنام کر گئے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ناسخ حقیقتاً اس بات کی صفائی نہیں کرنا چاہتے تھے اور نہ اس کو وہ اتنا اہم سمجھتے تھے، بلکہ ذہنی طور پر انھیں اس کا احساس ضرور تھا کہ بدخواہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا کہ مجھے خواہ مخواہ بدنام کر گئے۔ لفظ بدنام کے استعمال کا تیور کچھ ایسا تیکھا نہیں ہے جس سے یہ مترشح ہو کہ واقعی اس بدنامی سے ان کا کوئی ایسا راز کھل گیا جو انکی شخصیت پر اثر انداز ہوا۔ بلکہ اس کا عام لہجہ بالکل عام ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنا جائز حق پا جانے کے بعد ناسخ میں شدید جذباتی ردعمل پیدا ہوا ہو، اور اس طرح اپنے احساس فتحمندی کو تسکین دینے کے لیے ان واقعات کو قلمبند کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شاعر کے نزدیک اس سے زیادہ موزوں ذریعۂ اظہار کیا ہو سکتا ہے، جو ناسخ نے اختیار کیا ہے، سچ پوچھیے تو یہ کوئی ایسا معاملہ نہ تھا کہ وہ ان تمام حالات کو الف سے ی تک سپرد قلم کرتے تب انکی پیشانی سے اس بدنامی کا دھبّہ مٹ سکتا تھا۔ بلکہ یہ تنازعہ ناسخ اور ان کے بھائیوں کے درمیان تھا، عوام کو اس سے کیا غرض کہ وہ ناسخ سے بار بار صفائی طلب کرتے، بلکہ ان میں اکثریت ایسی ہو گی جو تماشہ بیں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے ہوں گے، ہاں یہ البتہ ہو سکتا تھا کہ ناسخ کے بدخواہوں نے ایک طرف بھائیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہو اور دوسری طرف اس معاملے کو اہم بنانے کیلئے ہوا بھی دیتے رہے ہوں جس کو ناسخ نے مستقبل کیلئے

نقصان دہ سمجھ کر اپنے بھائیوں سے یہ کہا ہو کہ میں تمہیں اپنا باپ[1] تصور کروں گا تم میرے اخراجات کے کفیل ہو جاؤ۔

بہرحال اس بیان کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ناسخ خدا بخش لاہوری کے غلام نہیں تھے اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ ان کے فرزند صلبی تھے یا نہیں تو اس سلسلے میں صدیقی صاحب کے استدلال کو ہم کیسے فیصلہ کن تسلیم کرلیں کہ ناسخ نے چونکہ اپنے بھائیوں سے جو گفتگو کی وہ مشتبہ ہے اس لئے وہ خدا بخش کے فرزند صلبی نہیں تھے، میرے خیال میں یہ کوئی قوی دلیل نہیں اس سے تو صاف طور پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کی طبیعت میں صفائی بہت تھی۔ اور دنیاوی مال و دولت کا لالچ نہیں تھا۔ یعنی وہ

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، صدیقی صاحب نے آزاد کے حوالے سے جس طرح اس عبارت کو پیش کیا ہے وہ خلط ملط ہو گئی ہے، لکھتے ہیں "جب خدا بخش کا انتقال ہوا تو بھائیوں نے میراث کا دعویٰ کیا۔ شیخ نے ان سے کہا کہ میں آپ کو اپنا باپ سمجھوں گا۔ میراث سے مجھ کو سروکار نہیں آپ میرے اخراجات کے متکفل ہو جائیے، انھوں نے وعدہ کرلیا۔ مگر ایک موقع پر ان کو زہر دیا گیا جس کی وجہ سے انھوں نے مقدمہ دائر کیا اور جیت گئے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ شیخ صاحب خدا بخش لاہوری کے فرزند صلبی یا متبنّٰی تھے" آزاد کی اصل عبارت یہ ہے "وہ مرگیا تو اس کے بھائیوں نے دعویٰ کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مال و دولت سے کچھ غرض نہیں ہے جس طرح سے ان کو باپ سمجھتا تھا آپ کو باپ سمجھتا ہوں۔ کہ جس طرح سے وہ میری خبر گیری کرتے تھے اسی طرح آپ فرمائیے انھوں نے قبول کیا۔

شیخ ناسخ فساد خون کی وجہ سے کبھی کبھی بینی روٹی کھایا کرتے تھے۔ بدنیت چچا نے اس میں زہر ملا دیا۔ لوگوں نے مصالحہ لگایا کہ ایک جن ان کا دوست ہے (حکایت عن قریب روایت کی جاتی ہے) بہرحال کسی قرینے سے معلوم ہو گیا اسی وقت چند دوستوں کو بلا کر ان کے سامنے ٹکڑا کتے کو دیا۔ آخر ثابت ہوا کہ فی الحقیقت اس میں زہر تھا۔ چند روز بعد وراثت کا جھگڑا۔

دنیاوی جاہ وجلال کے مطلق خواہاں نہ تھے اور نہ ان کی فطرت اس سے کبھی ہم آہنگ ہو سکتی تھی، پیسے سے مستغنی ہونے کا ثبوت ان کے قصائد[1] نہ لکھنے سے بھی فراہم ہوتا ہے۔ ورنہ ناسخ نے جو عہد پایا اس وقت وہ قصیدہ نویسی سے کافی متاع جمع کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا بالکل نہیں کیا۔ جہاں تک ناسخ کا اس دور میں پیسے سے مستغنی ہونے کا سوال ہے وہ کوئی بعید از فہم بات نہیں کیونکہ وہ دور تو بہرحال دولت کی فراوانی کا تھا۔ بلکہ آج بھی بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو قناعت پسند مل جاتے ہیں کہ اس دور ابتلا میں بھی مال و دولت کا لالچ نہیں رکھتے اور خاص کر شعرا[2] کے سلسلے میں تو ایسی مثالیں کثرت سے مل جائیں گی، بہرحال ناسخ کی طبیعت کی مثال کوئی اجنبی یا انہونی چیز نہیں جو دنیا میں وقوع پذیر نہ ہوتی ہو، بلکہ ناسخ کا انداز گفتگو ایک قانع اور پاک باطن شخص کے نظریۂ زندگی کا غماز ہے، ان تمام مباحث کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا بخش لاہوری کے پسر متبنیٰ نہیں تھے۔ کیونکہ اس ضمن میں صاحب[3] سراپا سخن کی سند زیادہ وقیع اور قابل اعتبار ہے وہ خدا بخش لاہوری کو ناسخ کا باپ بتاتے ہیں اور پھر اس کے قبل مصحفی[4] سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے لہٰذا اغلب گمان یہی ہے کہ ناسخ خدا بخش لاہوری کے فرزند حقیقی[5] تھے۔

---

[1] اس امر پر سب متفق ہیں کہ ناسخ نے عمر بھر قصیدہ نہیں کہا۔ راقم الحروف

[2] اصغر، حسرت، فانی، جگر کے علاوہ بھی بہت سے ایسے فنکار ہیں جو آپ کو مل سکتے ہیں۔ جو قناعت کی زندگی بسر کر چکے ہیں اور کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ راقم الحروف

[3] سید محسن علی محسن شاگرد رشک "سراپا سخن"

[4] مصحفی، ریاض الفصحاء

[5] مصحفی اور محسن میرے نزدیک زیادہ معتبر ہیں کیونکہ بقیہ جتنے تذکرہ نویس ہیں، وہ سب ان دونوں کے بعد کے ہیں اور سب نے سنی سنائی باتوں پر یقین کیا ہے اور کسی نے تحقیق کرنے کی زحمت نہیں کی۔ راقم الحروف

چونکہ زیر بحث مسئلہ بڑی حد تک طے پا گیا ہے اس لئے اسی کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب کے کچھ مزید نجی حالات پر بھی روشنی ڈالتے چلیں۔

مصحفی لکھتے ہیں [1]

"۔۔۔۔ ۔ جوانِ سیمین، وسپاہی وضع حلیم الطبع ومہذب الاخلاق۔۔۔"

مصحفی کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ جوان رعنا تھے اور وضع سپاہیانہ رکھتے تھے اس باب میں تمام تذکرہ نویس متفق تھے کہ بدن کسرتی اور پھرتیلا تھا۔

کریم الدین [2] اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

" ناسخ کا ڈیل ڈول بھاری اور تیز ذہن، رنگ کالا تھا۔ کہتے ہیں کہ بہت موٹا آدمی تھا۔"

مصحفی اور کریم الدین کے بیانات کے بعد آزاد اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں۔

" پہلوان سخن کو ابتدائے عمر سے ورزش کا شوق تھا خود ورزش کرتے تھے بلکہ احباب کے نوجوانوں میں جو حاضر خدمت ہوتے اور ان میں سے کسی ہونہار کو ورزش کا شوق دیکھتے تو خوش ہوتے اور جوڑ دلاتے، ۱۲۹۷ ڈنڑ کا معمول تھا کہ "یا غفور"، کے عدد ہیں۔ یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا۔ البتہ موقع اور موسم پر زیادہ ہو جاتے تھے، انھیں جیسا ریاضت کا شوق تھا ویسا ہی ڈیل ڈول بھی لائے تھے، بلند بالا فراخ سینہ، منڈھا ہوا سر، کمھاروے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے جیسے شیر بیٹھا ہے، جاڑے میں تن زیب کا کرتا، بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دوہرا کرتا پہن لیا۔"

---

[1] مصحفی ..... ریاض الفصحار

[2] کریم الدین :۔ طبقات الشعرار

مندرجہ بالا بیانات چونکہ اختلافی نہیں اس لئے ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ناسخ جسمانی طور پر پہلوان تھے اور انھیں یقیناً کثرت وغیرہ کا بہت شوق تھا چونکہ ابھی ہم نے اُن کی جسمانی ساخت اور ہیئت سے بحث کی ہے اس لئے بے محل نہ ہوگا اگر ہم ان کی خوراک پر بھی روشنی ڈالتے چلیں۔ جو ناسخ کی زندگی کا غیر معمولی پہلو ہے۔

اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو بیانات ہیں جن میں کافی مماثلت ہے پہلے محمد حسین آزاد[1] دوسرے مولانا شاہ سیّد نذیر احمد صاحب[2] سکندرپوری ثم الہ آبادی کے بیانات۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے آزاد کا بیان پیش کیا جائے، محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔

"دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے ظہر کے وقت وہ دسترخوان پر بیٹھتے تھے اور پھر تو کئی کئی وقتوں کی کسر نکال لیتے تھے پانچ سیر پختہ وزنِ شاہ جہانی ان کی خوراک تھی خاص خاص ——— اگر میووں کی فصل ہوتی تو جس دن کسی میوے کیلئے جی چاہتا تھا اس دن کا کھانا موقوف ——— مثلاً جامنوں کو جی چاہا تو سینیاں بھر کے بیٹھ گئے، ۴-۵ سیر وہی کھا ڈالیں۔"

---

[1] محمد حسین آزاد، آبحیات ———

[2] مولانا شاہ سید نذیر احمد صاحب سکندرپوری ثم الہ آبادی (دائرہ شاہ اجمل رحمۃ اللہ علیہ) مضمون سر:۔ دائرہ شاہ اجمل قدس سرّہ اور شیخ امام بخش ناسخ مرحوم، رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۱ء، ایڈیٹر ڈاکٹر

آزاد کے بعد مولانا نذیر احمد صاحب کا بیان بھی لطف سے خالی نہیں۔

"مقدار خوراک ان کی اب تک دائرہ میں ضرب المثل ہے۔ نورتن[1] بوا صبح کو ناشتے میں ایک سیر کے پراٹھے، ایک سیر قیمہ، کبھی اتنی ہی مقدار گوشت کے کباب دس پانچ فیرنی کے پیالے، انڈے وغیرہ، مٹھائیاں مستزاد لے کر جاتیں، شیخ ناشتہ فرماتے اور بہت ہی سادگی سے تمام کھانا چٹ کر جاتے، دوپہر ایک سیر کے نمکین چاول ایک سیر کے پراٹھے، ایک سیر کا قورمہ، چند قسم کے میٹھے، ادھر کی دال یہ چیزیں دوپہر کے کھانے میں ضرور تھیں۔

حضرت شاہ علی جعفر[2] اور شاہ غلام حیدر[3] صاحب کے یہاں سے کبھی کبھی چند قابیں کھانے کی آیا کرتی تھیں، ان حریف قابوں کو بھی شیخ مرحوم صاف کر جایا کرتے تھے۔"

مولانا آزاد اور مولانا نذیر احمد صاحب کے بیان بلاشبہ بہت دل چسپ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قرین قیاس بھی ہیں، اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ شیخ صاحب بمقابلہ ایک اوسط انسان کے کافی خوش خوراک تھے، رہا یہ اختلاف کہ دن بھر میں دس سیر کھاتے تھے یا پندرہ سیر یہ کوئی تاریخی یا ادبی افادیت نہیں رکھتا اس لئے اس سے بحث کرنا لاحاصل ہے۔

اب اس ضمن میں ان کے معمولات کی بات آتی ہے تو اس سلسلے میں سوائے آزاد کے ہمیں کوئی تذکرہ نویس تفصیلی یا اجمالی مواد فراہم نہیں کرتا اور آزاد کے بعد تمام تذکرہ نویس انھیں کے بیان کو بنیاد بنا کے سب کچھ لکھتے ہیں لہذا بہتر یہی ہے،

---

[1] بقول مولانا نذیر احمد "یہ وہ ماما تھیں جو حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کی سرکار سے حضرت شیخ کے ناشتے اور کھانے کی ذمہ دار تھیں [2] یہ موصوف حضرت مولانا نذیر کے عزیز تھے [3] یہ بھی مولانا نذیر احمد کے عزیز خاص تھے۔

کہ آزاد ہی کے بیان پر اکتفا کی جائے، آزاد لکھتے ہیں [1]

"یہ بھی معمول تھا کہ پہر رات رہے سے ورزش شروع کرتے تھے صبح تک اس سے فارغ ہوتے تھے مکان مردانہ تھا، عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا، اوّل نہائے اور پھر صحن میں کہ صفائی سے آئینہ رہتا تھا۔ مونڈھے بچھے ہیں، اندر ہیں تو فرش اور سامان آرائش سے آراستہ ہے، صبح سے احباب اور شاگرد آنے شروع ہوئے دوپہر کو سب رخصت اور دروازہ بند، حضرت دسترخوان پر بیٹھے، یہ بڑا کام تھا۔ چنانچہ اس بھاری کو اٹھا کر آرام فرمایا، عصر سے پھر آمد شروع ہوئی، مغرب کے وقت سب رخصت، دروازہ بند، خدمتگار کو بھی باہر کیا، اندر سے قفل جڑ دیا۔ کوٹھے پر ایک کمرہ خلوت کا تھا، وہاں گئے کچھ دیر سو رہے اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر فکر سخن میں مصروف ہوئے ..... شاگرد جو غزلیں اصلاح کو دیتے تھے لوٹا کر انھیں ایک کھاروے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتا تھا وہ بنایا کرتے تھے، جب پچھلا پہر ہوا تو کاغذ تہہ اور پھر وہی ورزش۔"

آزاد نے ناسخ کے معمولات پر جس قدر روشنی ڈالی ہے اس قدر تفصیل ان سے پہلے کے کسی ذکر میں نہیں ملتی، اس طرح آزاد کے بیان کی نہ تو کسی تذکرہ سے تردید ہوتا ہے اور نہ تصدیق۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ اس غیر ضروری بحث کو ہم یہیں ختم کر دیں، اس ضمن میں ایک بات رہی جاتی ہے، وہ ہے حضرت ناسخ کا..... پابند آداب محفل رہنا، اس کی تفصیل فٹ نوٹ میں ملاحظہ فرمائیں [2]، جہاں ناسخ

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد ــــ آبحیات۔

[2] مولانا آزاد لکھتے ہیں " آداب محفل کا بہت خیال تھا آپ تکیے سے لگے بیٹھے رہتے تھے، شاگرد جن میں اکثر امیرزادے، شرفا، ہوتے تھے باادب بچھونے کے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

کی پابندیٔ آداب کا ذکر آزاد نے کیا ہے وہیں انھوں نے ناسخ کے کچھ لطائف و ظرائف[1] بھی لکھے ہیں جو صرف آبِ حیات کے صفحات تک محدود ہیں اور ان میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ لہٰذا طوالت کے ڈر سے ان کا ذکر عمداً کرنا نہیں چاہتا۔

اس کے علاوہ ناسخ اور آتش اور ان کے دیگر حریفوں کے باہم ادبی معرکوں[2] کا بھی ذکر کیا ہے جو آبِ حیات کے علاوہ دیگر پرانے تذکروں میں نہیں ملتے۔ ان واقعات میں کتنی صداقت ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ان تفصیلات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم ناسخ کی اس زندگی کا تھوڑا سا جائزہ لیں گے جو فیض آباد سے لکھنؤ تک مختلف رئیسوں کے دربارداروں سے متعلق رہی ان کی تفصیل[3] سے بحث ان کے سفر اور جلا وطنی کے حالات کے سلسلے میں ہوگی۔ ان کی اس زندگی کا آغاز فیض آباد سے ہوتا ہے جب کہ اس دور میں نواب محمد تقی خاں ترقی[4] کا دربار گرم تھا اور ارباب فضل و کمال ان کے دربار سے وابستہ تھے، چونکہ ناسخ کو کثرت کرنے اور بدن بنانے کا شوق تھا اس لئے جسم کسرتی ہو گیا تھا اور اس زمانے میں رؤسا کو ترچھے بانکے ملازمین کو اپنے ہاں رکھنے کا شوق تھا، لہٰذا اسی بہانے ناسخ کی رسائی نواب صاحب کے دربار تک ہو گئی، پھر کیا تھا وہاں رہ کر درباداری کی مشق ہو گئی۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) حاشیے پر بیٹھتے جاتے تھے دم مارنے کی مجال نہ تھی، شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے، جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے "ہوں"، ایک شخص غزل سنانی شروع کرتا، کسی شعر میں کوئی لفظ قابل تبدیل ہوتا یا پس و پیش کے تغیر سے کام نکلتا تو اصلاح فرماتے ہیں، تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں نکال ڈالو یا اس کا پہلا یا دوسرا یہ قافیہ خوب ہے مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا وغیرہ ..." [1] ان لطائف کے سلسلے میں دیکھئے آبِ حیات ۴۴۸ تا ۴۴۹ (راقم) [2] ان معرکوں کی (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

اس سلسلے میں مؤلف گل رعنا[1] کا بیان ملاحظہ کیجئے :۔

”نواب محمد تقی فیض آباد کے امیر کو ایسے بانکوں ترچھوں کے رکھنے کا شوق ہو گیا تھا، ان کو نوکر رکھ کر لکھنؤ لائے ..... بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے انھوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا۔ وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیّت کی رو سے ان کو مل گئی، اب آسودہ حال ہو گئے اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر بود و باش اختیار کی“

جیسا کہ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جب آصف الدّولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کے لکھنؤ کو اپنا دار السلطنت بنایا تو ہر چہار طرف سے عوام و خواص نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور خاص کر فیض آباد کی بہار تو سمٹ کے لکھنؤ آ گئی[2]

ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ فیض آباد کے رؤسا اور ان کے مصاحبین لکھنؤ سے اپنا قرب ہونے کے باوجود ترک سکونت نہ کرتے۔ مؤلف گل رعنا کا بیان بلا شبہ قابل قبول ہے، چونکہ ناسخ لکھنؤ آنے سے قبل ایک نواب کے دربار سے وابستہ تھے اس لئے وہ یقیناً دربارداری کے ضروری ہتھکنڈوں سے

(بقیہ گذشتہ صفحہ) بھی تفصیل آبحیات میں ۴۵۴ تا ۴۵۸ موجود ہے (راقم الحروف)

[2] زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کی اس زندگی کا مکمل جائزہ ان کے سفر اور انکی جلا وطنی کو بنیاد بنا کر لیا جائے (راقم الحروف) [3] عبدالحی :۔ گل رعنا

---

[1] عبدالحی :۔ گل رعنا ۳۴۰ تا ۳۵۸ [2] مولانا عبدالحلیم شرر ”مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ“ اب لکھنؤ میں حاکم اور فرمانروا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے کی وجہ سے عام خلقت کا رخ لکھنؤ کی طرف ہو گیا، جو لوگ شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں بس گئے تھے انھوں نے بھی فیض آباد کو چھوڑ کے لکھنؤ میں آ کے بسنا شروع کیا (مشرقی تمدن کا آخری نمونہ)

واقف ہو گئے۔ رہ گئی بات لکھنؤ میں میر کاظم علی رئیس کے دامن دولت سے وابستہ ہونے کی تو یہ بھی غیر یقینی اور ناقابل قبول امر ہیں۔

جہاں تک ناسخ کو میر کاظم علی رئیس لکھنؤ سے کچھ جائداد ملنے کا واقعہ گل رعنا میں مذکور ہے، اس باب میں دیگر تذکرہ نویس کچھ نہیں لکھتے، صرف عبدالحی[1] سے یہ روایت ہم تک پہونچی ہے اور نہ کسی کو صحیح طور پر یہ معلوم ہے کہ وہ فیض آباد سے لکھنؤ کس سن میں آئے۔ البتہ مصحفی کے بیان کے مطابق جب انھوں نے ناسخ کو دیکھا تو اس وقت ان کی عمر ۳۰[2] سال کی تھی، بہرحال اغلب گمان یہ ہے کہ ناسخ جس وقت آئے ہونگے اس وقت وہ جوانی کے کچھ قیمتی ایام گذار چکے ہونگے مؤلف گل رعنا[3] کے ایک اور بیان سے یہ مترشح ہے کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی سے بروابط خاص ہونے کے سبب ناسخ کے تعلقات مرزا حاجی صاحب سے بڑھے جو لکھنؤ کے باوقار اور ذی استعداد حضرات میں سے تھے اور ان کا رابطہ خاص دربار اودھ سے تعلق پیدا کرنے کا موقع ہاتھ آیا اور یہی دور ناسخ کے متعدد بار عروج اور زوال کا دور ہے جس کی تفصیل آئندہ کے صفحات میں آئے گی۔ اب جبکہ ناسخ کی لکھنؤ میں آمد کے بعد ان کی عمر کا ذکر چھڑ گیا تو بہتر ہے کہ ناسخ کی علمی استعداد اور آغاز شاعری کا جائزہ لیا جائے کیونکہ بقول آزاد اور عبدالحی یہی دور ہے جب انھوں نے تحصیل علم شروع کی۔ اس باب میں پہلے آزاد[4] کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

" فارسی کی کتابیں حافظ وارث علی لکھنوی سے پڑھیں اور

---

[1] عبدالحی، مؤلف گل رعنا۔

[2] مصحفی کی عبارت یہ ہے " دیدش عمرش سی و ہفت سالہ است "

[3] عبدالحی، مؤلف گل رعنا

[4] مولانا محمد حسین آزاد ۔ آبحیات

علمائے فرنگی محل سے بھی تحصیلی کتابیں حاصل کی تھیں
اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی۔ مگر رواج علمی اور
صحبت کی برکت سے فن شاعری کی ضرورت سے پوری
واقفیت تھی اور نظم سخن میں ان کی نہایت پابندی کرتے
تھے، شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے، مگر ابتداء سے
شعر کا عشق تھا۔"

اسی ضمن میں عبدالحیؒ کا بیان بھی پیش خدمت ہے۔

"حسن اتفاق سے مکان کے سامنے گلی بیچ مولوی وارث
علی کا کمرہ تھا۔ وہ گھر بیٹھے طلباء کو مفت درس دیا کرتے
تھے ان کو بھی شوق ہوا۔ جو کتاب وہ پڑھاتے اور ان کے
مناسب حال ہوتی، لیکر بیٹھ جاتے اور روز کے روز سبق
یاد کر لیتے، اسی طرح رفتہ رفتہ اچھی خاصی استعداد ہو گئی جو کہ
فن شاعری کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی تھی۔"

چونکہ ہمارے سامنے ان دو تذکروں کے علاوہ اور کوئی تذکرہ نہیں ہے
جو ان سے پہلے کا ہو اس لئے ہمیں دونوں بیانات کی روشنی میں ناسخ کی علمی
استعداد کا جائزہ لینا ہوگا۔ جہاں تک ہر دو مصنف کی آراء کی سند کا سوال
ہے یہ دونوں اس قابل نہیں کہ ان پر مکمل طور پر اعتماد کیا جائے، مولانا آزاد
جس شخص کا حوالہ دیتے ہیں ان کی شخصیت نہ تو تاریخی ہے اور نہ ادبی۔ یہ
ضرور ہے کہ آزاد نے اپنے نجی تعلقات کی بنا پر انھیں معتبر جانا ہے۔ ہو سکتا
ہے وہ کوئی معتبر اور ثقہ بزرگ ہوں مگر ناقدین ادب کے لئے ان کی شخصیت
اس لئے باوزن اور قابل اعتماد نہیں کہ ان کا ذکر آزاد کے علاوہ نہ تو کوئی....
تذکرہ نویس کرتا ہے اور نہ شاعر، اس طرح ان کی شخصیت کا اعتماد آبحیات کے

صفحات تک محدود ہے اس لئے آزاد کا بیان سو فیصدی کیسے صحیح ہوسکتا ہے اب دوسری طرف مولانا عبدالحی مؤلف گل رعنا ہیں یہ بھی بڑے بوڑھوں کی روایت کا حوالہ دیکر حالات کو سپرد قلم کرتے ہیں، لہذا ان کی بھی سند مکمل طور پر قابل اعتماد نہیں لیکن پھر بھی اچھا یا برا، معتبر یا غیر معتبر جو کچھ بھی مواد ہم تک پہونچا ہے وہ انھیں دو بزرگوں کا ہے، لہذا انھیں کے بیانات کو بنیاد بنا کر ہمیں کسی فیصلے پر پہونچنا ہے ناسخ نے خواہ وارث علی لکھنوی سے بالمشافہ لیا ہو خواہ ان کی آواز کو سن کر طلبا کے سبق کے ساتھ ساتھ خود بھی گھر بیٹھے سبق یاد کرتے ہوں یہ کوئی ایسی بحث نہیں جسے طول دیا جائے۔ البتہ یہ متعین ہو گیا کہ ناسخ نے وارث علی لکھنوی سے تحصیل علم کی تھی۔

اب تھوڑی دیر کیلئے جو امر بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ ناسخ نے کچھ تعلیم اوائل عمری میں حاصل کی تھی یا لکھنؤ آنے کے بعد باقاعدہ درس شروع کیا اب تک اس کا تعین نہیں ہوسکا البتہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی[۱] نے عبدالحی

---

۱ صدیقی "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں رقمطراز ہیں، لکھنؤ میں تعلیم اور شاعری کیطرف متوجہ ہوئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف توجہ ہوئی تو عمر کا بڑا حصہ گذر چکا تھا، وارث علی لکھنوی سے بقدر ممکن استعداد بہم پہنچائی اسکے علاوہ درس و تدریس کا ذکر کسی بھی تذکرہ نویس نے نہیں کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی قابلیت بہت معمولی ہوگی۔ مؤلف گل رعنا لکھتے ہیں کہ ابتدا ہی سے شاعری کا شوق تھا جو غالباً نواب محمد تقی خاں کی ملازمت میں پیدا ہوا ہوگا لیکن تائید میں کوئی سند نہیں ملتی ۱۱۹۵ھ میں انھوں نے سودا کے مرنے پر تاریخ کہی وہ ان کے دیوان میں موجود ہے میر حسن نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں ختم کیا اس میں ان کا کلام یا حال نہیں ہے، ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں علی ابراہیم خاں نے اپنا "تذکرۂ ابراہیم" مرتب کیا اور اس میں تین سو سے زائد شعرا کا حال لکھا اس میں بھی ان کا ذکر نہیں ملتا ہے گلشن ہند ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں تمام ہوا اس میں بھی ان کا ذکر نہیں ......،

کے بیان کو بنیاد بنا کر اس پر استدلال کیا ہے لیکن اس کے مقابل مصحفی کا بیان بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔ جس وقت مصحفی نے ناسخ کو دیکھا اس وقت ناسخ کی عمر ۳۷ سال کی تھی جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پیش کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ مصحفی نے ناسخ کے ذوق شعری کو بھی سراہا ہے بہرحال مصحفی آزاد اور عبدالحئی کے بیان کے پیش نظر ہمیں صدیقی صاحب کے فیصلے پر اتفاق کرنا پڑے گا کہ ناسخ فطری طور پر موزونیٔ طبع ضرور رکھتے تھے۔ مگر جہاں تک تحصیل علم کا مسئلہ ہے وہ لکھنؤ پہونچنے پر ہی شروع ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ رواج زمانہ کے مطابق ان کی تعلیم اوائل عمری میں تھوڑی بہت ہوئی ہو مگر عربی اور فارسی کا باقاعدہ اور مسلسل درس لکھنؤ میں لیا ہو اس کا جواز یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کے اصحاب[1] فن کی صحبتوں میں رہ کر علم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا ہو اور یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں اس کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں جن میں سب سے نمایاں مثال حضرت شیخ سعدیؒ کی ہے جو خود اپنے بارے میں معترف ہیں کہ ع

چہل سال عمر عزیزت گذشت

لہذا ہم نے اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا کہ ناسخ نے یقیناً عمر کا اچھا حصہ گذر جانے کے بعد تحصیل علم کی، یہ دوسری بات ہے کہ موزونیٔ طبع[2] کی بنا پر اوائل عمری سے ہی شعر کہتے رہے ہوں۔ مگر زمانے کا رنگ دیکھ کے شریک محفل نہ ہوتے رہے ہوں کہ اپنی علمی استعداد پر بھی مکمل اعتماد

---

[1] مرزا حاجی وغیرہ کی صحبتیں جن میں ہمیشہ زبان و بیان کی تراش خراش پر بحثیں رہتی تھیں۔ (راقم الحروف)

[2] مصحفی ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں "از سن بیست سالگی بمقتضائے موزونی طبع فکر شعر ھندی می کند....."

پیدا نہ ہو سکا ہو، جیسا کہ آزاد[1] نے لکھا ہے، آزاد کے بیان سے ایک حد تک یہ صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ناسخ نے ایسا ہی کیا ہو۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناسخ نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا یا نہیں، اس ضمن میں سب سے پہلا بیان مصحفی کا ہے جس پر قریب قریب سب کو اتفاق ہے۔

"حصہ لخمت الوان ایں خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہاست و بہ فقیر ہم رسوخ از تہہ دل دارد مقسوم گشت۔"

اس تحریر سے یہ مترشح ہے کہ ناسخ نے بہر حال مصحفی کی صحبت سے فائدہ اٹھایا

---

[1] آغاز شاعری کا حال فرمایا کہ میر تقی میر مرحوم زندہ تھے، جو مجھے ذوق سخن نے بے اختیار کیا ایک دن اغیار کی نظر بچا کے کئی غزلیں خدمت میں لے گیا۔ انھوں نے اصلاح نہ دی، میں دل شکستہ ہو کر کے چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں فرشتہ نہیں، اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔

چنانچہ کہتا تھا اور کہہ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر دیکھتا تھا جو کچھ سمجھ میں آتا تھا اصلاح کرتا اور رکھ دیتا۔ کچھ عرصہ بعد پھر فرصت میں بناتا اور نظر ثانی کرتا غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ لیکن کسی کو سناتا نہ تھا جب تک کہ مجھے خوب اطمینان نہ ہو جاتا تھا۔ مشاعرے میں غزل نہ پڑھی نہ سنائی۔ مرزائی صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، سید انشا، مرزا قتیل، جرأت، مصحفی وغیرہ سب شعراء جمع ہوتے تھے، میں جاتا تھا، سب کو سنتا تھا مگر وہاں کچھ نہ کہتا تھا..... غرض سید انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے، جرأت اور لہو اللہ نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے۔ جب زمانہ سارے درق الٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مصحفی نے کچھ دنوں کے بعد ناسخ کو اپنے ایک شاگرد بیتاب[1] کے سپرد کیا لیکن یہ بیان مصحفی کے مقابلے میں زیادہ وقیع نہیں، پھر آزاد نے ایک طرف میر کا بھی واقعہ نقل کیا، لیکن قطب الدین باطن کا بیان بھی ملاحظہ فرمائیں جو نہایت ہی مضحکہ خیز اور مہمل ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"کسی کو گمان ہے کہ شاگرد آتش محترم ہیں کوئی بیان کرتا ہے کہ اوسکے اوستاد مرزا اکرم ہیں، غرض مختلف روایات کا بیان ہے۔"

بہرحال ہم اس بیان کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتے، کیونکہ ان سے پہلے اور بعد کے کسی تذکرے میں اس قسم کی بات نہیں لکھی گئی ہے جو اس قدر مجہول ہو۔ کوئی یہ کہتا[2] ہے کہ مصحفی کے شاگرد تھے۔

غرض جتنے منھ اتنی باتیں ——

لہذا یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے باقاعدہ کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ مصحفی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے ہوں اور یہ نتیجہ زیادہ قابل قبول ہے۔

ہم نے اس طویل بحث میں ناسخ کی تعلیم اور مشق سخن کا جائزہ لیا۔ اب ہمارے سامنے ناسخ کی زندگی کے دو دور ہیں، جن پر سیر حاصل بحث کرنی ہے اوّل تو یہ کہ ناسخ کو کتنی بار جلاوطنی اختیار کرنی پڑی، دوم یہ کہ انتقال کے وقت ان کی عمر کیا تھی اور کس عقیدے سے تعلق رکھتے تھے، پھر یہ کہ ان کے بعد ان کے

---

[1] عبدالرؤف عشرت آب بقا میں لکھتے ہیں "مصحفی نے ایک مرتبہ ناسخ کی غزل اپنے شاگرد بیتاب کو اصلاح کیلئے دیدی اس روز سے خفا ہوگئے اور اصلاح لینا ترک کردی" [2] شیخ احمد حسین سحر لکھنوی بہار بیخزاں میں لکھتے ہیں "ناسخ تلمیذ مصحفی سحر بیاں استاد نزاکت بندان زماں بود"

پسماندگان میں کون کون تھا۔

اب ہم سب سے پہلے ان کی جلاوطنی کا حال بیان کریں گے، ناسخ کی جلاوطنی ان کی سیاسی ریشہ دوانیوں کے سبب ہوتی رہی، ان کی اس سیاسی زندگی کے ثبوت میں بابو بہت پرشاد[1] بورخ تاریخ اودھ ۱۸۶۰ء کا بیان ملاحظہ ہو۔

"..... اور نواب معتمد الدولہ کا خطاب وزیر اعظم ہوا، دن بدن اس کا نصیب زور کرتا تھا جو اس سے خلاف ہوتا تھا وہ مارا پیٹا جاتا تھا..... یہاں تک کہ نواب محسن الدولہ کہ حضرت کے نواسے تھے اور بادشاہ بیگم اپنی نانی کے پاس رہتے تھے قسمت کی خوبی سے امام بخش ناسخ اور انور علی بیگ اوستاد نے انھیں بادشاہ بیگم سے جدا کر دیا۔ اور بادشاہ بیگم اور مرزا ولیعہد میں فساد کا باعث ہوا۔ اور چند روز بعد میر فضل علی داروغہ اور فیض النسا رمخلانی کو بڑے ظلم سے بادشاہ بیگم کی سرکار سے نکلوا دیا۔ اس دن بڑا کشت وخون ہونے کو تھا پر صاحب رزیڈنٹ یہ حال دیکھ کر واسطہ امن ہوئے۔"

اس تحریر کی روشنی میں ہمیں سب سے پہلے اس کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی ناسخ کو دربار اودھ کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے دلچسپی تھی اور انھوں نے اکثر ان میں نمایاں حصّہ لیا لیکن ناسخ کے لکھنؤ سے متعدد بار نکالے جانے کے سلسلے میں مورخین یا تذکرہ نویس کسی تفصیل سے کام نہیں لیتے اور اگر چند تذکرہ نویس حضرات نے اس پر کچھ روشنی بھی ڈالی ہے تو یہ بیانات مبہم اور پر پیچ ہو گئے ہیں، جن کو بنیاد بنا کے ہم ان کی جلاوطنی اور واپسیٔ وطن کے ادوار کا تعیّن وثوق کے ساتھ

---

[1] بابو بہت پرشاد ـــــ مصنّف تاریخ اودھ ۱۸۶۰ء
قلمی نسخہ، رضا رامپور لائبریری

نہیں کر سکتے، آزاد کچھ لکھتے ہیں اور نجم الغنی[1] تاریخ اودھ میں کچھ اور باتیں کہتے ہیں بہر حال ناسخ کے لکھنؤ چھوڑنے کے مکمل اور تفصیلی اسباب کہیں نہیں مل پاتے ہیں البتہ اس کا ذکر ضرور مل جاتا ہے کہ انھیں بعض وجوہ کی بنا پر لکھنؤ سے نکلنا پڑا اس طرح جلاوطنی میں کانپور، الہ آباد، بنارس اور عظیم آباد کا سفر کیا۔ اس سلسلے میں جو پہلا تذکرہ مواد فراہم کرتا ہے وہ ہے "گلشن بے خار" جس کی متعلقہ عبارت حسب ذیل ہے۔

"تمام عمر لکھنؤ گزارینده، نوبتے از کارکنان دولت آنجا
ایمن نبوده مجال سکونت نیافته به الہ آباد شتافته باز به کانپور
عود نموده داکنوں بسبب تغیر و تبدل دوره اراکین سابق نوع
به مرکز کرده، گویند که در ایام فراق لکھنؤ واحباب لکھنؤ اشعار درد آمیز
گفته وقصه نقل او دراز است که این مختصر گنجائے آں را نباید"

بالو ہست پرشاد اور شیفتہ کے بیانات سے اس قدر تو اندازہ ہو گیا کہ اودھ کے دربار کی سیاسی اچالوں سے ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا، شیفتہ نے کسی قدر اسکو

---

[1] لکھنؤ سے نکلنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب انکی تعریفوں کی آوازیں بلند ہوئیں تو نواب معتمد الدولہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیں معتمد الدولہ ان کے با اخلاص شاگرد تھے جب یہ پیغام پہنچا تو انھوں نے بگڑ کے کہا مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا نواب کے مزاج میں دہشت لگی تھی حسب الحکم شیخ صاحب کو لکھنؤ سے نکلنا پڑا اور حیدر دزالہ آباد میں جا کر رہے، نواب مرگئے تو پھر لکھنؤ آئے۔"
شیخ نے نواب مہدی کے زوال پر ہجو لکھی تھی اس وجہ سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور پھر حکیم مہدی کے زوال کے بعد لکھنؤ آئے۔"

تفصیل سے بیان کرنا چاہا۔ مگر وہ بھی یہ کہہ کے فارغ ہو گئے کہ "قصّہ نقل و حرکت اُو دراز است"، بہرحال ہمارے پاس اب تک مختلف تذکروں سے جو مواد فراہم ہو چکا ہے اسی کی بنیاد پر تجزیہ کریں گے،

کہا جاتا ہے کہ جب نواب معتمد الدّولہ کا عروج ہوا۔ تو انھوں نے اپنی سیاسی چالوں کے لئے آلۂ کار بنایا اور دربار اودھ میں اس قدر اثر پیدا کر لیا کہ جو چاہا وہ ہوا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی دور اندیشی سے یہ بھی تاڑ لیا تھا کہ کون اُنکی ترقی کی راہ میں رخنہ بن سکتا ہے، لہذا انھوں نے حکیم مہدی کو اپنا حریف سمجھ کر معزول کرا دیا اس پر ناسخ نے غزل[1] کہی، جس کا ذکر اس کے قبل کر چکا ہوں وہ غزل محمد خاں قوال نے معتمد الدولہ کے حضور گائی اور انعام حاصل کیا۔ اس طرح آٹھ سال تک ناسخ کا اقبال بلند رہا۔ یہی ناسخ کے شباب شاعری کا دور ہے لیکن جب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ناسخ کے حریف برسر حکومت ہوئے تو پرانے تمام واقعات تازہ ہو گئے، حکیم مہدی بحال ہوئے، اب ناسخ دربار میں طلب کئے گئے، مگر ناسخ نے اس وقت دور اندیشی سے کام لے کر لکھنؤ چھوڑ دیا اور الہ آباد کا رخ کیا۔ لیکن آزاد نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ پہلے نواب غازی الدّین حیدر نے انھیں قصیدہ پڑھنے کے وعدے پر ملک الشعرائی کا خطاب عطا کرنے کیلئے کہا تھا، جس کے ناسخ منکر ہوئے تھے۔

نجم الغنی اور آزاد کے بیانات کوئی تاریخی مماثلت نہیں رکھتے، آزاد نے بغیر کسی سند کے یہ بات لکھی ہے، جو ناسخ کا مزاج دیکھتے ہوئے بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے، البتہ نجم الغنی نے حکیم مہدی کے زوال پر ناسخ کی ہجو کا جو ذکر کیا ہے وہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ناسخ کو جتنی بار لکھنؤ چھوڑنا پڑا

---

[1] نجم الغنی :۔ تاریخ اودھ
[2] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری

اس کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی[۱] نے مختصراً پیش کیا ہے، جسکے سنین یہ ہیں:-
پہلی بار ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء ۔ دوسری بار ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء ۔ تیسری بار ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء ۔ لیکن افسوس ہے کہ ان سنین کی تفصیلات اور حالات بہ اعتبار دور نہ معلوم ہو سکے، صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ کانپور، بنارس اور عظیم آباد کے سفر کئے اور الہ آباد کا سفر تینوں بار کیا اس کی تصدیق ان کے اشعار سے ہوتی ہے الہ آباد سے متعلق اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

قطب الاقطاب کی ناسخ ہے میسّر پابوسی
کوئی ابدال کے چومے کوئی اوتاد کے ہاتھ

---

[۱] یہ واقعات ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء ۔ ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء ۔ اور ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء کے ہیں۔ اور اس کی روداد یہ ہے کہ پہلی مرتبہ حکیم مہدی کے عروج پاتے ہی لکھنؤ سے نکلنے اور کانپور رہتے ہوئے الہ آباد پہونچے تھے اور شاہ ابوالمعانی کے مہمان ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں بنارس اور عظیم آباد کے سفر کا اتفاق ہوا۔ ان کی قسمت کہ حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد چلے گئے اور یہ لکھنؤ واپس آ گئے اس واقعے کی تاریخ خود کہی ؎

افتاد حکیم از وزارت — تاریخ بطرز نو رقم کن
از جائے حکیم ہشت برگیر — سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ نے دوبارہ قلمدان وزارت حکیم مہدی کے سپرد کیا اور ناسخ لکھنؤ سے نکلے اور پھر الہ آباد دائرۂ شاہ اجمل میں قیام کیا اس کا ذکر ناسخ نے خود کیا ہے ؎
ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم — آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

تین تربینی تو دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

رو رہا ہوں کیا الہ آباد میں
دائرہ جو ہے یہاں گرداب ہے

یاں سے اسّی کوس وہ محبوب ہے
وصل کا اب کون سا اسلوب ہے

اسی سلسلے میں بنارس سے متعلق ایک شعر پیش ہے، کہا جاتا ہے کہ ناسخ نے سوچا کہ بنارس ہی میں عمر بھر کے لئے بیٹھ رہیں مگر اپنی ملّت کے لوگ نہ پائے تو اکتا کر الہ آباد آ گئے ؎

جو کانپور سے ناسخ چلو بنارس کو
مزار پاک جناب علی حزیں دیکھو!

اب آپ کے سامنے وہ اشعار پیش ہیں جن سے کانپور کے سفر کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی اخلاقی حالت کا بھی پتہ چل جاتا ہے ؎

یہ نوچے کھاتے ہیں زندوں کو کانپور کے لوگ
کہ جیسے کھاتے ہیں مردوں کو زاغ گنگا میں
یہ کانپور میں رُدو کہ اے مری آنکھو!
نہ فاصلہ رہے گنگا میں اور جمنا میں

ہے ترا حیران سارا کانپور
بن گیا ہے سطح گنگا آئینہ

البتہ ناسخ نے دوسری بار جب کانپور سے لکھنؤ کا رُخ کیا تو اس سلسلے میں ناسخ کے شاگرد خاص میر اوسط علی رشک نے ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے جو رشک کے دیوان میں موجود ہے ؎

اوستاد زماں نے لکھنؤ کو	فرمایا کانپور سے جب کوچ
اس کوچ کی عیسوی ہے تاریخ	یکشنبہ و غرّۂ رجب کوچ

۱۸۳۲ء

لیکن عظیم آباد سے متعلق کوئی شعر اب تک میری نظر سے نہیں گذرا کہ اسے میں پیش کر سکوں۔ البتہ مورخین ادب کا یہ کہنا ہے کہ وہاں کے لوگوں کی خوش خلقی سے ناسخ بہت خوش تھے، مگر انھیں یہ شکوہ تھا کہ عظیم آباد میں رہ کر ان کی زبان خراب ہو جائے گی۔

ناسخ نے اپنی جلاوطنی میں وطن کو یاد کر کے کہے ہیں وہ یقیناً پر اثر ہیں اور اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ناسخ کو وطن چھوڑنے پر بہت ملال تھا۔ بقول شیفتہ[1] جو "اشعار درد آمیز" ناسخ نے کہے ہیں وہ مختصراً ملاحظہ ہوں

سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

ناسخ وطن میں دیکھئے دیکھیں گے گھر کو کب
غربت میں مدتوں سے ہے اپنا مکاں سرا

اتنی مدت سے ہوں میں وادیٔ وحشت میں خراب
کہ وطن جاؤں تو پاؤں نہ کبھی گھر اپنا

---

[1] "گویند کہ در فراق لکھنؤ و احباب لکھنؤ اشعار درد آمیز گفتہ" گلشن بے خار

دشت سے کب وطن کو پہونچوں گا
کہ چھٹا اب تو سال آ پہونچا

خبر نہ شام غریبی کی مجھ کو تھی ناسخ
چھپی ہوئی تھی یہ صبح وطن کے پردے میں

اتنی مدت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھ کو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

میں نے عمداً چند اشعار پیش کئے ہیں، ورنہ لکھنؤ کی یاد میں ان کے کلیات میں متعدد اشعار بکھرے پڑے ہیں،

چونکہ ناسخ کی زندگی کے یہ آخری ایام تھے اس لئے فطری طور پر بے سہارگی کے احساسات شدید ہو گئے تھے،

اب اس کے بعد کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں جس پر روشنی ڈالی جائے اسلئے اب ان کی تاریخ وفات سے بحث کی جائے گی اور ان کی عمر کا بھی تعین ہوگا۔ اس ضمن میں مولانا آزاد سے اختلاف آرا، شروع ہوتا ہے ورنہ سب اس پر متفق کہ اُن کی عمر ۶۵ سال اور ۷۰ سال کے درمیان تھی جب وہ انتقال کر گئے۔ لیکن آزاد لکھتے ہیں:-

" لوگ کہتے ہیں ۶۴ ـ ۶۵ برس کی عمر تھی۔ مگر رعمی سلمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تقریباً سو برس کی عمر ہو گی۔ اکثر عہد سلف اور نواب شجاع الدولہ کی باتیں آنکھیں دیکھی بیان کرتے تھے۔"

مولانا آزاد نے جن بزرگ کا حوالہ دیا ہے وہ میر اوسط علی رشک کے

مقابلے میں معتبر نہیں کیونکہ رشک ناسخ کے شاگرد خاص تھے اور رشک ہی کے توسط سے اُن کی صحیح عمر معلوم ہو جاتی ہے ؎

"مرد اے ہے بسال شست و نہم"

اس مصرع سے ان کی عمر[1] ۶۹ سال کی ثابت ہو رہی ہے لیکن بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ناسخ نے سودا کے انتقال پر یہ قطعہ بھی کہا تھا ؎

از دشت آباد دنیا رفت بہ خلد رفیع سودا
گفتم سال وفاتش ناسخ شاعر مصد دستاں واویلا

اس طرح یہ عین ممکن ہے کہ ان کی عمر سو سال کی ہوئی ہو مگر وہ لوگ شاید یہ بھولتے ہیں کہ کوئی ضروری نہیں کہ ناسخ اس دور میں موجود ہوں جب سودا کا انتقال ہوا ہو۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ ناسخ کو سودا کے مزاج شاعری سے زیادہ ہم آہنگی

---

[1] قاضی عبدالودود (مضمون نقوش لاہور ۱۹۵۷ء) نے اس پر یوں استدلال کیا ہے۔ "آب حیات میں ناسخ کا سال وفات ۱۲۵۴ھ درج ہے اور سند میں رشک کا یہ مادۂ تاریخ پیش ہوا ہے ؎

"دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے" (آبحیات ص ۳۵۲)

مگر اس سے ۱۲۴۷ھ نکلتا ہے، رشک نے اپنے عہد کے املا کے مطابق "اٹھی" لکھا تھا اور ظاہر ہے اس صورت میں مصرع مرقوم سے ۱۲۵۴ھ مخرج ہوگا۔ دیوان رشک میں جو غالباً آزاد کی نظر سے نہیں گزرا۔ ذیل کا قطعہ تاریخ ہے جو سن وفات کے علاوہ روز ماہ و تاریخ پر بھی مشتمل ہے ؎

وا دریغا کرد رحلت ناسخ معجز بیاں
انتقالش داد عالم را غم جانکاہ وائے
یک ہزار و دو صد و پنجاہ چارم سال بود
بود آں ماہ محرم پنجمیں آں ماہ وائے

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ہونے کی وجہ سے عمر کے کسی حصے میں ان کی تاریخ وفات نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو، جس کی وجہ سے لوگ اس دھوکے میں آجاتے ہیں کہ ناسخ نے اسی دور میں یہ قطعہ تاریخ کہا ہے جبکہ سودا نے انتقال کیا۔ بہرحال ان مختلف آراء کے مقابل سب سے زیادہ معتبر بیان رشک ہی کا ہے لہٰذا ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ناسخ نے ۶۹ سال کی

گذشتہ سے پیوستہ :-

"رشک روز مرگ تاریخ و سنین و ماہ گفت
بود ہجم لیست و چارم پنجشنبہ آہ وائے"

رشک کے ایک مادۂ تاریخ سے سن عیسوی بھی نکلتا ہے۔ صد حیف ہائے ناسخ صد حیف ہائے ناسخ۔
ناسخ کی وفات رشک کے اس قطعے کے مطابق پنجشنبہ کے دن چوبیسویں جمادی الاولیٰ کو ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۶ء میں واقع ہوئی۔ رشک کے وہ قطعات جو ناسخ کی وفات سے متعلق ہیں ؎

در کانپور بودم کہ این واقعہ شنیدم
کز دہر منتقل شد در خلد جائے ناسخ
سال وفات جستم تاریخ شد مسیحی
صد حیف ہائے ناسخ صد حیف ہائے ناسخ

اے جناب ناسخ معجز بیاں
کشتیٔ شعر و سخن را ناخدائے
اے زباں دان مضامیں آفریں
اے لغت دان محقق ہائے ہائے

مردی و ہاتف پئے تاریخ گفت
بود واللہ شاعرے بے مثل بود

رگ پے داغ دختہ تا ابد کردی
بیا پے ظلم بے پایاں و حد کردی
نوشتم سال مرگ ناسخ ایں مصرع
بچہ ہے ہے عشرہ سید مہ بد کردی

یہ قطعات راقم نے دیوان رشک سے پیش کیے (راقم)

عمرِ طبعی کو پہونچ کر لکھنؤ میں روز پنجشنبہ چوبیسویں جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں انتقال کیا اور ٹکسال میں مدفون ہوئے۔

اب اس کے بعد آزاد کے بیان سے ایک اختلافی مسئلہ شروع ہوتا ہے آزاد کہتے ہیں کہ "شیخ صاحب کا مذہب پہلے سنت جماعت تھا پھر مذہب شیعہ اختیار کیا"، آزاد نے بغیر سند کے اپنی طرف سے یہ بات کہی ہے جس کی تردید خود انھیں[۱] کے ایک بیان سے ہو جاتی ہے "ناسخ اگر شیعہ ہوتے تو وہ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں نے سید کا دامن پکڑ لیا ہے اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا" کیونکہ دائرۂ شاہ اجمل[رح] کے سادات کا تعلق مذہب شیعہ سے قطعی طور پر نہیں تھا اور اس ماحول میں جو کہ اہل تشیع کے مسلک کے خلاف ہے ایک شیعہ عقیدے کا انسان کیسے رہ سکتا تھا اس کے علاوہ ناسخ کا یہ شعر بھی بہت حد تک ان کے عقیدے کا ترجمان ہے ؎

قطب الاقطاب کی ناسخ ہے میسّر پابوس
کوئی ابدال کے چومے کوئی اوتاد کے ہاتھ

مزید برآں ناسخ نے جہاں حضرت علیؓ کی شان میں متعدد اشعار اور غزلیں کہی ہیں وہیں بعض ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن سے ناسخ کی عقیدت آل اور اصحاب سے مترشح ہے علاوہ ازیں ناسخ نے اپنی نظم "شہادت نامۂ آل نبیؐ" میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو بڑے عقیدت مندانہ انداز میں یاد کیا ہے۔

ان تمام مباحث کا مقصد یہ ہے کہ اکثر لوگ ناسخ کی منقبتوں سے انھیں شیعہ ثابت کر دیتے ہیں حالانکہ وہ لوگ یہ بھولتے ہیں کہ اہل سنّت میں ایک طبقہ اہل تصوّف کا

---

[۱] آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:-

"پہلی بار الہ آباد میں آئے ہوئے تھے جو راجہ چندو لال نے بارہ ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا انھوں نے لکھا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑ لیا ہے اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ جاؤں گا تو لکھنؤ جاؤں گا۔"

ہے جو حضرت علیؓ کو "باب العلم" سمجھ کر ان کی پیروی کرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے یہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کو تصوّف سے کیا لگاؤ۔

تو پھر اس سلسلے میں ایک اور بات ملحوظ خاطر رکھیں کہ ناسخ جس دور میں دربار اودھ سے منسلک ہوئے وہ دور شیعیت کے عروج کا تھا شاہان اودھ تعیش پسند ہونے کے باوجود اپنے عقائد میں بہت سخت تھے ایسے حالات میں ناسخ نے خاصی حکمت عملی سے کام لیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ سُنّی ہونے کے باوجود دربار کے اہم مسائل میں رخنہ اندازی کر سکتے تھے اس صورت میں صرف یہی ایک راہ تھی کہ وہ اس بات کا اظہار کرتے کہ مجھے شیعیت سے دلچسپی ہے اور اس کا واحد ذریعہ ان کے پاس منقبت لکھنے کا تھا جو انھوں نے کیا۔ بہرحال منقبت لکھنے سے اگر کوئی شخص شیعہ ہو سکتا ہے تو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے تمام مسلمان شیعہ ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ ان دونوں طبقوں کے بنیادی اختلافات کو دنیا جانتی ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ ہو سکتا ہے کہ ناسخ تفضیل علیؓ کے قائل ہوں، مگر انھیں صاف طور پر شیعہ نہیں کہا جا سکتا۔

ناسخ کی مکمل زندگی کا جائزہ لینے کے بعد آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ ان کے بعد ان کے پسماندگان میں کوئی تھا یا نہیں۔ اس ضمن میں تین راوی ہیں اوّل زائر لکھنوی دوم آزاد، سوم مولانا نذیر احمد (دائرۂ شاہ اجملؒ الہ آباد)

زائر لکھنوی[1] کے بیان کے مطابق شیخ کے کئی لڑکے تھے، جن میں ایک لڑکا جس کا نام زین العابدین تھا وہ طبابت کرتا تھا اور خوش حالی سے بسر کرتا تھا۔ مگر آزاد کہتے ہیں کہ انھوں نے اہل و عیال کا جنجال ہی نہیں پالا تھا۔ پھر مولانا نذیر احمد

---

[1] قیصر التواریخ میں زائر لکھنوی لکھتے ہیں :-

"بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی، زین العابدین ان کا بیٹا محمد علی کا شاگرد طبابت کرتا تھا اور خوش حالی سے بسر کرتا تھا۔"

صاحب[1] آزاد کو اپنا رہبر بنا کر کہتے ہیں کہ شیخ نے تجرد میں زندگی گذار دی ان کے بعد تمام تذکرہ نویس سکسینہ تک یہی لکھتے ہیں کہ شیخ لاولد تھے لیکن اغلب گمان یہ ہے کہ شیخ کے اولاد ہوگی کیونکہ زائر ایک مؤرخ ہیں انھوں نے یقیناً تحقیق کے بعد ہی یہ بات لکھی ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ چند پیڑھیوں کے بعد ناسخ کا سلسلۂ نسب ختم ہو گیا ہو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ؎

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

ریختہ کُتب مرکز بیگ راج
1، 2، 3 اور برائے خواتین
اُردو ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)
بیگ راج: - +92-307-7002092

[1] مولانا نذیر احمد صاحب مضمون ۔ ناسخ دائرۂ شاہ اجمل میں ، رسالہ اردو سنہ ۱۹۳۴ء ایڈیٹر مولانا عبدالحق مرحوم ۔